جلد ۴۳ مورخہ ۱۴/۲۱ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء مطابق یکم ذوالحجہ / ۸ ذوالحجہ سنہ ۱۳۵۸ھ نمبر ۲۹۱

الحکم کی تنتالیسویں جلد کا آغاز

آغاز کردہ ام تو رسانی بہ انتہا

الحکم کے اس پرچہ کے ساتھ الحکم کی بیالیس منزلیں ختم ہوئیں۔ اور تنتالیسویں منزل کا آغاز ہوا۔

الحکم کی پہلی جلد کا آغاز اکتوبر ۱۸۹۷ء میں ہوا۔ اس کا آغاز کسی سرمایہ سے نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کا سرمایہ ایک دل تھا۔ جس کی قوت ایمانی نے اس کے مالک اور ایڈیٹر کو اس میدان میں گھوڑا دوڑانے کی تحریک کی۔ ایڈیٹر اور مالک کی جیب اس وقت بالکل خالی تھی۔ مگر اسے خدائی تصرفات پر یقین تھا۔

جب توکلت علی اللہ پہ آغاز کیا
پر نکل آئیں گے اور دیکھنا پرواز کیا

پس وہ مقام توکل ایسا تھا۔ کہ اس نے ایک گمنام بےکس بےبس کم مایہ انسان کو زمین سے اٹھا کر آسمان رفعت پر بٹھا دیا۔ الحکم بڑھا اور بڑھا۔ اور بڑھتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اسے یہ شرف حاصل ہوا۔ کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اسے اپنا بازو قرار دیا۔ پس الحکم اور صاحب الحکم حضرت مسیح موعود میں ہو کر ایک لازوال دولت۔ ایک لازوال عزت اور ایک لازوال حیات کو پا گئے۔

کہتے ہیں کہ خضر آب حیات کی تلاش میں نکلے تھے۔ مگر جب ڈھونڈ کے دیکھا۔ تو وہ آب حیات ہے جس سے حیات ابدی حاصل ہو۔ ... رسلین کا وجود پایا۔ جن لوگوں کو ان کی خدمت کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتے ہیں۔ وہ جس مٹی پر چلتے ہیں۔ وہ مٹی سونا ہو جاتی ہے۔ اور وہ جس چیز کو چھوتے ہیں۔ اسے آب حیات بنا دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے ہزاروں واقعات ایسے ہیں۔ جن سے تاریخ اسلام بھری ہوئی ہے۔ کیا ابوہریرہ کا ہی ایک واقعہ کم ہے۔ جن کو بھوک کی شدت سے غش آ جاتی تھی۔ مگر لوگ اسے مرگی خیال کر کے جوتیوں سے مارا کرتے تھے۔ وہی ابوہریرہ ایک دن اتنا عظیم الشان انسان ہوا۔ کہ شام کا گورنر ہو گیا اور کسریٰ کے درباری رومال میں تھوکنے لگا۔ اسی طرح کی صدہا مثالیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہیں۔ جن کو ان قدموں کو چھونے کی توفیق ملی۔ وہ ابدالآباد کے لئے زندہ ہو گئے۔ ان لوگوں میں سے ایک بانی الحکم و صاحب الحکم بھی ہیں۔ جن کو خدا نے اس سعادت سے حصہ وافر دیکر ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔ انہیں یہ توفیق ملی۔ کہ انہوں نے حضور کے سفر میں۔ سیر میں۔ مجلس میں آپ کی ہر حرکت و سکون کو جمع اور محفوظ کرنے کی سعی کی۔ انہوں نے اس کام کو عشق و محبت سے کیا۔ اور اس طرح سے کیا۔ کہ اس کے بدلے میں کسی قسم کا دنیاوی مفاد حاصل کرنے کی خواہش تک بھی نہ کی۔ الحکم کی زندگی کا مقصد ”ذکر حبیب“ تھا اور ہے۔ پرانے لوگوں ... نے الحکم کی قدر کی اور خوب کی۔ ان میں ایسے ایسے لوگ بھی تھے۔ جو سال میں ایک پرچہ پالینے سے اپنے دام وصول شدہ جانتے تھے۔ مگر افسوس اب ان لوگوں کی کمی ہو گئی ہے اور حدیث العہد لوگوں نے آ کر الحکم کی قیمت کا حساب صفحات اور سیاہی اور ورقوں سے لگانا شروع کیا ہے۔ اُن کے دل میں حضرت علیہ السلام کی محبت ہو گی۔ مگر میں ایسا دیکھتا ہوں۔ کہ بہت ہیں جو اس پاک ذکر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ اور ان کی آنکھیں نقائص کی تلاش میں رہتی ہیں۔ مجھے ایسے تنگ دل لوگوں سے بھی واسطہ پڑا۔ جنہوں نے کہا۔ ... کہ تم اپنی بیماری کا تذکرہ کیوں کرتے ہو۔ مجھے ایسے لوگ بھی ملے۔ جنہوں نے یہ کہا۔ کہ سیرت المہدی کی روایات کسی کتاب میں چھاپ دی جائیں۔ ان کے اخبار میں دینے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے ایسے لوگ بھی نظر آئے۔ جنہوں نے اس کی قیمت اس لئے دینے سے انکار کیا۔ کہ وہ باقاعدہ نہیں نکلتا۔ میں نے کئی قسم کے لوگ دیکھے اور ان کا مطالعہ کیا۔ میں اس سال نو میں ان تمام قسم کے احباب سے کہنا چاہتا ہوں۔ الحکم تو **ذکر حبیب کے لئے زندہ** ہے۔ اور یہی اس کی زندگی کا مقصد وحید ہے۔ اور وہ اس راستے سے ادھر ادھر نہیں جانا چاہتا ہے۔ جو جلوۂ طور کی داستان سننے کے لئے اپنے دل میں جذبۂ عشق رکھتا ہے۔ وہ الحکم کی طرف آئے۔ اور جو اس کوچۂ عشق میں چلنے میں تکلیف محسوس کرے۔ اس کے لئے بہت سے راستے کھلے ہیں۔ الحکم کیا ہے؟ **عہد وفا** کا علمبردار ہے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ اگر الحکم عہد وفا کا ایک نشان نہ ہوتا۔ تو وہ ۱۹۰۸ء کے بعد کبھی کا بند ہو گیا ہوتا۔ اس کے مالک و ایڈیٹر نے ایسی تکلیف دہ گھڑیوں میں جب وہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے ضروریات زندگی کو بھی تنگ پاتا تھا۔ الحکم کو جاری اور زندہ رکھا۔ سالوں پر سال گذر گئے۔ الحکم موت کی گھاٹیوں سے نکل نکل کر کھڑا ہوتا رہا۔ اور پھر خدمت دین کے لئے کمربستہ ہو جاتا رہا۔ مجھے اس صحابی کی سی جانبازی اور جانفروشی صاحب الحکم میں ہمیشہ نظر آئی۔ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی کا جھنڈا دیا۔ اور جب اس کا ایک ہاتھ کٹ گیا۔ تو اس نے دوسرے میں لے لیا۔ اور جب دوسرا بھی کٹ گیا۔ تو اس نے اپنے سینے سے اُسے چمٹا لیا۔ مگر اسے گرنے نہ دیا۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کہ حضرت عرفانی کبیر نے الحکم کو محض اس لئے کہ حضرت مسیح موعود نے اسے اپنا بازو

مطبوعہ ... سٹیم پریس قادیان ... [illegible]

قرار دیا ہے - ہر قسم کی قربانی پر اسے قایم رکھا - کئی دفعہ میں نے ان کو دیکھا - کہ ان کی جوتی ٹوٹ گئی - اور اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی - کہ اس کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا - مگر انہوں نے جوتی خریدنے پر الحکم کا پرچہ نکالنا مقدم کیا - کئی دفعہ میں نے ان کو دیکھا کہ ضروری کپڑے بنوانے سے انہوں نے اس لئے گریز کیا - کہ ان کپڑوں کی بجائے الحکم نکال لیں - میں نے کئی دفعہ دیکھا - کہ انہوں نے بچوں کی ضرورتوں کا کلیۃً گلا گھونٹ دیا - تاکہ ان ضرورتوں کی بجائے الحکم نکال سکیں - اور آج بھی اُن کی یہ حالت ہے - کہ وہ ہم کو سال میں بیسیوں مرتبہ یہ نصیحت کرتے ہیں - کہ :-

"تم لوگ ہر قربانی اور ہر قیمت پر الحکم کو زندہ رکھنا"

یہی نہیں بلکہ بارہا یہ بھی فرمایا - کہ :-

"اگر الحکم کا ایک بھی خریدار نہ رہے - تو تم سال میں ایک ہی پرچہ نکالنا اور اسے مفت تقسیم کر دینا - مگر بند نہ کرنا - اس لئے کہ یہ وہ اخبار ہے - جسے حضرت مسیح موعود نے اپنا بازو قرار دیا ہے"

ان فقرات سے اس دل کی گہرائیوں کو دیکھو - کہ ان میں کیا ہے - وہ صرف اور صرف جذبہ محبت ہے - عہد وفا ہے - وہ اسی محبت کی وجہ سے اس "بازو" کو جو معنوی طور پر لافانی ہو چکا ہے - ظاہری طور پر بھی لافانی دیکھنے کے متمنی ہیں - اور اس کے لئے جو پایا قربان کیا - اور آیندہ کے لئے تیار ہیں ناقدرشناسوں کی بے قدری کا رونا تو بارہا میں رو چکا ہوں - اب اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں - مجھے جس طرح اس عشق کی داستان کو دیکھکر مسرت اور حیرت ہوتی ہے - ویسا ان لوگوں کی حالت دیکھکر حیرانی ہوتی ہے - جو سالہا سال تک الحکم لیتے رہے ہیں اور اب قیمت اس لئے نہیں دیتے - کہ یہ باقاعدہ نہیں - کاش - ان کو بھی اس محبت سے حصہ ملتا ہے - جس محبت نے الحکم کو زندہ رکھا ہے - اگر یہ محبت کام نہ کرتی ہوتی - تو الحکم ایسے ہی مہربانوں کی وجہ سے کبھی کا مٹ چکا ہوتا -

اب نیا سال آ رہا ہے - اس سال کی مشکلات پہاڑ کی طرح بلند و بالا کھڑی ہیں - مجھے معلوم نہیں کیا ہوگا - کاغذ حد سے گراں ہو چکا ہے - میں اس سال بہت سے ایسے خریداروں کے نام الحکم کی فہرست سے کاٹ رہا ہوں - جو الحکم کی قیمت نہ دینا اپنے لئے باعث ثواب خیال کرتے ہونگے - میرے دل میں ایسے لوگوں کی طرف سے بہت بڑا صدمہ ہے - میں الحکم کے رجسٹر میں انکی نادہندگی کا نوٹ چھوڑ جاؤں گا - تاکہ آنیوالی نسلیں جب اس رجسٹر کو پڑھیں - تو ان کے اس احسان کو یاد رکھیں - جو انہوں نے الحکم سے روا رکھا - کئی دفعہ میرے دل میں خیال آیا - کہ میں اُن کے نام الحکم میں شایع کر دوں - اور دوسرے مخلص احباب کو کسی قسم کے شک میں پڑنے سے بچا سکوں - مگر پھر شرم دامنگیر ہوئی - اور شایع نہ کر سکا - اس سلسلہ اب ان ہی خریداروں کا ساتھ رہے گا - جو اس عہد وفا کے علمبردار ہونگے - الحکم کی مالی حالت کا بیان اس قدر کافی ہے - کہ الحکم کا کوئی فنڈ نہیں - وہ جس طرح یوم اجراء کے دن محض اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے شایع کیا گیا تھا - آج نصف صدی کے قریب پہنچ کر بھی محض اللہ پر توکل کر کے یہ نمبر شایع ہو رہا ہے -

ہمارے دامن میں آج بھی وہی ایمان ہے - اور ہمارے قلب میں وہی عشق کی چنگاری ہے - الحکم کا ماٹو ذکر احمد یا ذکر حبیب ہے - میں آج بھی بڑے عشاق احمد کو پکارنے پر مجبور ہوں - اے خدا کے فرستادہ کو دیکھنے والو - اور اس کے ذکر کی یاد میں سراسر متوالو - الحکم کی زندگی خطرے میں ہے تم آگے بڑھو - اور محض اس لئے کہ یہ اخبار بھی اس یاد کا علمبردار ہے - جس کی محبت کے تم متوالے ہو - تُو اس کے

معین و مددگار ہو جاؤ - میں نہیں میں اب تم پر بھی بھروسہ نہیں کرتا - بلکہ اپنے خدا کے حضور گرتا ہوں - اور اس سے مانگتا ہوں -

اے خدا

ظاہری اسباب الحکم کے لئے مفقود ہیں - تو خود اس کے لئے اسباب پیدا کرنا - اور اپنے فضل سے ایسے سامان پیدا کر دے - کہ روز روز کی آہ و زاریوں سے نجات ہو - اور الحکم ابدالآباد تک کے لئے تیرے پیارے مسیح موعود کے ذکر کے لئے ظاہری معنوں میں بھی زندہ ہو جائے -

اے خدا

تو اپنے فضل سے اعتراض کرنے والوں کے منہ بند کر - اور ان کے دل میں الحکم کی محبت ڈال دے -

اے الٰہ العالمین

تو ان لوگوں کے دل پر الہام نازل کر - جو اس کی قیمت نہیں دیتے - کہ وہ الحکم کی قیمت ادا کریں - اور اسے اپنے لئے جائز اور حلال تصور نہ کریں -

اے میرے پیارے محسن

مجھے توفیق دے - صحت اور قوت دے - کہ میں اس روح کے ساتھ اور اسی جذبہ عشق اور محبت سے الحکم کی خدمت کرتا چلا جاؤں - جس سے الحکم کے بانی اور مؤسس نے اب تک خدمت کی

اے خدا

تو خود سب روکیں اٹھا دے - اور اپنے فضل سے خود کفیل ہو جا - کہ میں تیری نصرت اور قدرت کے بغیر ایک قدم بھی اٹھانے کے قابل نہیں ہوں - آمین ثم آمین ؛

اس دعا کے بعد جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے - میں اس عہد کی تجدید کرتا ہوں - کہ انشاءاللہ میں ہر قیمت پر الحکم کو جاری رکھنے کی سعی کروں گا - وباللہ التوفیق ؛

یہاں میں اس وصیت کو بھی درج کر دینا ضروری سمجھتا ہوں - جو حضرت اقدس والد صاحب قبلہ نے مجھے ابھی حال ہی میں ان الفاظ میں فرمائی -

"اگرچہ الحکم کی مالی حالت مخدوش ہے - مجھے اس کا غم نہیں - اس نے اسی قسم کے ابتلاؤں میں اپنی عمر کے ۴۴ سال پورے کئے ہیں - میں ... اپنی اولاد اور الحکم کے رفیقوں کو وصیت کر چکا ہوں - کہ وہ

الحکم کو ہر قیمت پر زندہ رکھیں

اور اس کوشش میں اپنی جان دیدیں - الحکم سلسلہ کا پہلا علمبردار ہے اور اس لوائے احمدیت کی ہر حالت میں حفاظت کریں - پھر فرمایا :-

"اور میں اپنی اولاد کو پھر وصیت کرتا ہوں - کہ وہ الحکم کو ہر قربانی پر زندہ رکھیں - اسکے موضوع اور مقصد میں اس چیز کو مقدم کریں - جو اسکے عمل میں اب تک رہا ہے دنیا کی کوئی دولت اور طاقت اس موضوع سے انہیں الگ نہ کر سکے - وہ صداقت کے منادی ہوں اور حق کے کہنے میں دلیر اور مخلص ہوں

میں اس وصیت پر قایم رہنے کیلئے انتہائی جد و جہد کروں گا ...

ہمارے سلسلہ کا جدید لٹریچر

خلافت حقہ

(۱)

سلسلہ عالیہ احمدیہ کی ترقی خدا تعالیٰ کے فضل سے ہر رنگ میں ہو رہی ہے - ان فضلوں کو جو سلسلہ کی ترقی کے لئے رونما ہو رہے ہیں آج اُن کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا - تاہم ان فضلوں میں سے ایک بڑا فضل یہ ہے - کہ یہ زمانہ

عصر اشاعت کا زمانہ ہے

اور ہم کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس زمانہ میں غیر معمولی سہولتیں اشاعت دین کے لئے مہیا ہیں - اور یہ کیوں نہ ہوتا - جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے نبی اور راستباز کو

سلطان القلم

بنا کر بھیجا - حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کو بھی اس وصف سے بطور انعام وافر حصہ دیا گیا ہے - اور ہر سال متعدد کتابیں صداقتوں کی جلوہ گاہ اور براہین نیرہ سے متأثر ہو کر منصۂ شہود پر آتی ہیں چنانچہ اس سال جو کتابیں معرض وجود میں آئی ہیں - اُن میں سے ایک کتاب موسومہ "خلافت حقہ"

جو حضرت مولانا میر محمد سرور شاہ صاحب قبلہ کی قلم حقیقت رقم سے لکھی گئی ہے - شائع ہوئی ہے - کون نہیں جانتا کہ مولانا موصوف کا مقام سلسلہ عالیہ احمدیہ میں بہت بلند ہے - کیا بلحاظ ان کے علم و فضل کے اور کیا بلحاظ اُن کے تقویٰ و طہارت کے وہ سلسلہ کے ان علماء میں سے ہیں - جن کی علمی قوت کا سکہ سلسلہ سے الگ ہونے والوں اور سلسلہ کے مخالفوں تک نے بھی مانا ہے - آپ کا علم اس قدر ٹھوس اور وسیع ہے - کہ آپ اپنے تبحر علمی کے لحاظ سے ہمیشہ ممتاز رہینگے - آپ نے اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے جو آج مصری فتنہ کے نام سے اٹھا یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے مصری صاحب کو اپنے علم کا گھمنڈ تھا - اور انہوں نے خیال کیا تھا - کہ وہ خلافت حقہ پر علمی رنگ میں حملہ آور ہو سکتے ہیں - اسلئے انہوں نے اپنے خیال میں ایک مایۂ ناز مسئلہ پیش کیا - اور وہ مسئلہ

عزل خلفا

کا مسئلہ تھا - جس پر انہوں نے بزعم خود بڑے بڑے دلائل دیئے مگر دراصل اُن کے دلائل ایک علمی دھوکہ سے بڑھکر حقیقت نہیں رکھتے تھے - اس کتاب میں حضرت مولوی صاحب نے مصری صاحب کے علم کے بوسیدہ عبا کا دامن تار تار کر کے رکھ دیا ہے میں حضرت مولوی صاحب کے دلائل پر توجہ دلانے کا ایک مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں - مگر حضرت مولوی صاحب نے مصری صاحب کے دلائل کی حقیقت ایک ہی فقرے میں یوں کھول کر رکھ دی ہے فرماتے ہیں :-

"آج کل تو جناب شیخ صاحب کے دماغ اور انکے حواس کی کچھ عجیب ہی حالت ہے - ایک چیز نہیں ہوتی - اور ان کو دکھائی دینے لگتی ہے - حوالہ خود لکھیں گے - اور اس میں ایک بات کا نام و نشان نہیں ہوگا - اور وہ شور مچا دینگے - کہ یہ حوالہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے - اور بعض حوالے لکھیں گے - ان میں ایک چیز ہر ایک کو صفائی کے ساتھ نظر آتی ہوگی - اور وہ شور ...

ناظرین الحکم عید الاضحیٰ مبارک ہو

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علیٰ عبدہ المسیح الموعود
ھو الناصر

ارض حرم "قادیان" کی ابتدائی تاریخ

اور

قادیان کی بستی کا احیاء اور اسکی عظمت کا دور

یعنی

نئی زمین اور نیا آسمان

حضرت بھائی عبد الرحمن صاحب قادیانی کی قلم سے

قصبات اور شہروں سے دور گوشۂ گمنامی میں مستور ایک چھوٹا سا گاؤں بلکہ موضع اور کورویہ لاہور سے ستر میل شمال مشرقی گوشہ پر ضلع گورداسپور تحصیل و تھانہ بٹالہ کی حدود میں واقع تھا۔ جیسے قصبات و شہر تو درکنار معمولی دیہات و مواضعات ضلع و تحصیل میں بھی کوئی شہرت یا نمایاں حیثیت حاصل نہ تھی۔ نام اس کا اس زمانہ میں کچھ ایسا غیر معروف و نامعلوم اور دنیا کے کان اس سے ایسے ناآشنا تھے کہ سنہ یا ۱۳۱۱ھ ہجری میں جب عبد اللہ آتھم والی پیشگوئی کا چرچا ہوا۔ تو میرے استفسار پر بتلانے والوں نے جو کچھ بتایا وہ یہ تھا۔ کہ

دُور کہیں رُوس کی سرحد پر

کوئی گاؤں ہے۔ جہاں کے کسی مولوی صاحب نے ایک انگریز کی موت کی پیشگوئی کی ہے۔

پھر جب سنہ ۱۳۱۲ ہجری کے ماہ جون میں میں کپور تھلہ ہوتا ہوا بٹالہ پہنچا۔ تو ڈیرہ بابا نانک۔ کلانور۔ بھاگووالہ۔ علیوال۔ لنگروال۔ گلانور۔ سری گوبند پور۔ ہرچووال اور بھام تک کے نام میرے کان میں پڑے۔ مگر قادیان کے نام سے میرے کان آشنا نہ ہوئے۔ گاڑی کے سٹیشن پر پہنچتے ہی یکہ بان۔ وغیرہ اور گدہ والے کئی گھیرے جیتے بھاگتے تھے۔ میں چند گھنٹے منڈی اسٹیشن اور کچہری کے آس پاس پھرا کیا۔ مگر قادیان کا نام میں نے نہ سنا۔

دوبارہ جب اللہ کریم نے سیالکوٹ میں میری دستگیری کے سامان مہیا فرمائے۔ قادیان کا نام میں نے کتابوں میں پڑھا۔ انوار الاسلام اور نشان آسمانی کا مطالعہ نصیب ہوا۔ نور ایمان کی شعاعوں سے میرے دل و دماغ کو منور کیا۔ اور میری خواہش

اظہار اسلام

پر محترم بزرگ حضرت میر حامد شاہ صاحب نے مجھے قادیان جانے کا اس شرف سے مشرف اور سعادت سے بہرہ ور ہونے کا مشورہ دیا۔ اور میں بٹالہ اتر کر قادیان پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آپ شاید تعجب کرینگے

اور میرے بیان کو مبالغہ سمجھیں گے۔ کہ مجھے اس وقت بھی بہت مشکلات کا سامنا ہوا۔ میں لوگوں سے قادیان کا راستہ پوچھتا وہ میرے منہ کو تکتے اور سوچ بچار کر کہتے۔ کہ

کادیں تو ایک گاؤں ہے

تم جو نام لیتے ہو۔ وہ اس نواح میں تو ہے نہیں۔ تھانہ سے پوچھو شاید پتہ لگ جائے۔

نو بجے غالباً ٹرین بٹالہ پہنچی۔ بارہ بج گئے۔ مجھے قادیان کا پتہ ملا نہ راستہ۔ حتیٰ کہ میں گھبرا کر واپس لوٹ جانے کی فکر کرنے لگا۔ اسی کشمکش و پیچ میں تھا۔ کہ ایک شخص میرے قریب آ کر بولا۔

جی آپ نے قادیان جانا ہے؟

میں افسردہ و پژمردہ ہو رہا تھا۔ اور پریشان تھا۔ کہ کروں تو کیا؟ اس شخص کی آواز سے ڈھارس بندھی اور امید کی ایک جھلک نظر آئی۔ میں نے اس سے قادیان کا اتا پتا دریافت کیا۔ تو اس نے جواب دیا۔

وہی نا۔ مرزا صاحب والی قادیان

گنوار لوگ اس کو کادیں، کماڈیں کر کے پکارتے ہیں۔ میں خود قادیان کا رہنے والا ہوں۔ حضرت صاحب گاؤں کے رئیس اور مالک ہیں۔ میں آپ کو ان کے دروازہ پر جا اتاروں گا۔

اس تسلی کے بعد میں اس کے یکہ میں بیٹھ گیا۔ اور وہ مجھے یہ کہکر بازار کو گیا۔ کہ

گھوڑے کے واسطے نہاری لے آؤں

مگر یکہ بان ایسا گیا۔ کہ لوٹنے کا نام ہی نہ لیا۔ کم و بیش ایک گھنٹہ میں اس یکہ میں ٹنگا رہا۔ نہ اس کو چھوڑ سکوں نہ یکہ بان کی تلاش کر سکوں۔ جمعہ کا دن تھا۔ میں نے سیالکوٹ سے روانگی میں اسی غرض سے جلدی کی تھی۔ کہ جمعہ کی نماز میں شریک ہو کر اس برکت سے حصہ پا سکوں گا۔ مگر یکہ بان کی طمع نے مجھے نماز جمعہ میں شرکت کی برکت سے محروم رکھا۔ کیونکہ وہ دراصل

نہاری کی بجائے سواری

کی تلاش میں تھا۔

قصہ کوتاہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے قادیان پہنچا۔ وہ زمانہ سنہ ۱۳۱۲ ہجری کا تھا۔ میں نے قادیان کو جس حالت میں دیکھا۔ وہ نظارہ اپنا چشم دید لکھنے کی کوشش کروں گا۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

قادیان آتے ہوئے سڑک کے موڑ کے قریب پہنچ کر یکہ بان نے اشارہ سے بتایا۔

وہ ہے قادیان

میری پہلی نظر مسجد اقصیٰ کے خوبصورت گنبدوں اور کونوں کے میناروں پر پڑی۔ جن میں خدا جانے کیا تاثیر۔ جذب اور کشش تھی۔ کہ میرا دل ایک

سکینت۔ تسلی اور اطمینان

سے بھر گیا۔ اور ساری کوفت اور گھبراہٹ و بے قراری جاتی رہی۔ دل ایک تیز پرواز کی تمنا کرنے لگا۔ کہ میسر آ جائے تو اُڑ کر پہنچوں۔ قادیان پہنچکر بڑی لمبی چوڑی فصیل پر نظر پڑی۔ تو اس کے پہلے وقتوں کے عروج و اقبال اور عظمت و شوکت کی خیالی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ کیونکہ آثار و علامات اس امر کی دلیل تھے۔ کہ یہ مقام کبھی

بھاری قلعہ اور ایک مضبوط حصار

ہوا کرتا ہوگا جس میں رہتے رہتے جو اچھی طرح دیکھا۔ تو یہ دیکھا۔ کہ بستی ایک فصیل کے اندر محدود تھی۔ جو جا بجا شکستہ و خستہ تھی۔ چوڑائی اس کی تیس تیس فٹ اور اونچائی بوجہ گر جانے کے پوری معلوم نہ ہو سکی۔ جو دیکھی وہ بعض جگہ سے آٹھ دس فٹ ضرور تھی۔

آثار۔۔۔ اس فصیل کے سوائے شمال مغربی کونہ کے چاروں اطراف میں نمایاں تھے۔ میں نے جو سرسری سا تخمینہ اس فصیل اور بستی کا کیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ لکھ سکتا ہوں۔ کہ فصیل تقریباً مستطیل شکل میں واقعہ تھی۔ جس کا طول بیرونی حدود تک کم و بیش گیارہ سو اور عرض نو سو فیٹ تھا۔ فصیل کے اندرونی جانب تخمیناً اٹھارہ بیس فٹ چوڑا ایک کوچہ گول سڑک کے طریق پر برابر چاروں طرف چھوڑا ہوا تھا۔ جو آج کل دائیں بائیں کی دست برد کا شکار ہو کر آٹھ اس۔ بارہ اور چودہ فٹ رہ گیا ہے۔ بلکہ بعض حصوں میں تو بالکل غائب اور ختم ہو چکا ہے۔ اس گول سڑک کے اندر اندر ہی اس زمانہ میں آبادی تھی۔ فصیل اور گول سڑک کو چھوڑ کر اصل زیر آبادی حصہ کی پیمائش تخمیناً ایک ہزار فٹ طویل اور آٹھ سو فٹ عریض تھی۔

فصیل کے چاروں کونوں پر چار برج اور چار ہی اس میں دروازے تھے۔ یعنی پہاڑی دروازہ۔ بٹالوی دروازہ۔ ننگلی دروازہ اور سوری دروازہ۔ فصیل کے باہر بڑے بڑے اور پرانے بوٹوں کا گویا ایک گھنا جنگل کھڑا تھا۔ جہاں دن دہاڑے خوف آتا۔ رات کے اندھیرے میں تو کم ہی کوئی فصیل سے باہر نکلتا ہوگا۔ اس خار مغیلاں کے دشت سخت کے بالکل ساتھ لگی ہوئی ایک **کھائی یا خندق** تھی۔ جو چاروں طرف عموماً سال بھر پانی سے بھرپور رہتی۔ کئی کئی میل دور سے برسات کا پانی اس نشیب میں آن جمع ہوا کرتا تھا۔ اور گویا ایک قدرتی امداد اور غیبی تائید تھی اس قلعہ کی حفاظت کی۔ جو اسے قدرت کی فیاضی سے مفت میں میسر تھی۔ قصبہ کی رونق۔ شادابی اور خوبصورتی کے لئے قصبہ سے باہر کئی باغات تھے۔ جو چاروں طرف دور دور تک پھیلے ہوئے بہت بڑے رقبہ میں لگائے اور سجائے گئے تھے۔ جن کے اثمار شیریں اور معطر و مصفا ہوا سے حاکم و محکوم برابر فائدہ اٹھایا کرتے۔

اس مرکز کی حفاظت و مضبوطی کے لئے چاروں اطراف وقتی ضروریات کے مدنظر مناسب مقامات پر دور و نزدیک ایک اور **معاون و حفاظتی** قلعوں کی لائین تھی۔ جن میں سے بسرا **کھارا۔ ٹھیکری والا۔ رسول۔ وڈالہ۔ کنڈیلا** اور **ڈھپئی** کے قلعوں کے آثار تو آج تک بھی واضح اور عیاں موجود ہیں۔ اور بعض زمانہ کی دست برد کی نذر ہو چکے ہیں۔ اس قلعہ بندی اور حفاظت و تنظیم پر نظر غائر ڈالنے سے مرکز کی مضبوطی شان و شوکت اور زیر نگیں ریاست کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز اس عالی ہمت اولوالعزم اور اقبال مند خاندان کے حسن تدبیر۔ انتظامی قابلیت۔ قوت عمل اور علو ہمتی کو جانچا جا سکتا ہے۔ جس نے ہزاروں میل سے آ کر ان

جنگلوں میں منگل

کر دیا۔ اور ایک مستقل ریاست کی بنیاد رکھی۔ جس کے خود مختار رئیس ایک ایسے خوش نصیب اور قابل رشک فارسی النسل وجود کی یادگار تھے۔ جس کی قلبی کیفیت خالق ارض و سما کے حضور ایسی قبول ہوئی۔ خدا نے اس کے کسی عمل۔ اس کی کسی ادا کو پسند فرمایا۔ اور دنیا کے عظیم ترین اور مقدس ترین خدا کے مقبول رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس محبت کی اور اس کو اپنے دست شفقت سے نوازا۔ بالکل سچ۔ صحیح اور درست و حق ہے

مصفیٰ قطرہ باید کہ تا گوہر شود پیدا

خدا کے انبیاء و رسل نجیب الطرفین اور عالی خاندان ہوا کرتے ہیں۔ تا اُن کی بیعت۔ اطاعت اور غلامی کو عار اور ذلت و توہین سمجھ کر لوگ ہدایت اور دولت ایمان سے محروم نہ رہ جائیں۔

حکمران خاندان کی جوانمردی۔ اولوالعزمی۔ بیدار مغزی۔ ہمت و استقلال اور فہم و ذکاء کے ساتھ اُن کی فیاضی۔ نیکی اور عدل و انصاف کا ایسا چرچا تھا۔ کہ دور دراز سے حق و صداقت کے پیاسے اور اکثر اہل اللہ اُن کی صحبت کے فیض سے مشرف ہونے کو جمع رہتے۔ یہاں تک کہ اُن کے دسترخوان پر پانچ پانچ سو علماء۔ فضلاء۔ حفاظ اور صلحاء کا مجمع رہتا۔ اور اللہ اور اس کے رسول کے اقوال و اعمال کے تذکرے رہتے۔ اور دین داری و پرہیزگاری کا یہ عالم تھا۔ کہ کوئی بھی ان میں تارک نماز نہ تھا۔ حتیٰ کہ پنہاریاں تک تہجد گذار تھیں۔ القصہ اُس بے دینی و جہالت کے زمانہ میں یہ مقام علم و فضل اور نیک و پاک مقاصد کا مرکز تھا۔ طوائف الملوکی اور ضعف و ادبار کے زمانہ اور تنگی و مشکلات کے ایام میں بھی ان لوگوں نے فیاضی اور عطا و سخا کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور بعض تفرقہ زدہ مسلمان رئیسوں کو کئی گاؤں بطور مروّت دے دیئے۔ اور اس طرح عسرت کی حالت میں بھی دل کھول کر شرفاء کی امداد کرتے رہے۔ ایسی ہی باتوں سے اس ظلم و فساد اور فسق و فجور کے زمانہ میں اس بستی کو لوگ اسلام پور

مکہ کے نام سے

یاد کرنے لگے تھے۔ کیونکہ اس بد امنی اور جھگڑے فساد کے زمانہ میں مسلمانوں کے لئے یہی **قصبہ مبارکہ** پناہ کی جگہ تھی۔ اس کے سوا ہر جگہ کفر اور فسق و فساد اور ظلم نظر آتا تھا۔ قادیان گویا اس زمانہ میں حامیان دین۔ صلحاء۔ علماء اور نہایت شریف اور جوانمرد لوگوں سے مل کر ایک **باغ** بنا ہوا تھا۔ جس کے اثمار علم و عمل۔ نیکی۔ تقویٰ اور عدل و انصاف سے آس پاس کے علاقے متمتع ہوا کرتے تھے۔ اور اس کے حکمران اپنے اوصاف و اطوار کے باعث **جہانبانی** کے اہل اور حکمرانی کے مستحق یقین کئے جاتے تھے۔ (ماخوذ از کتاب البریہ)

یہ تو ہوا تصویر کا روشن پہلو اور مسلمان خاندان کی حکومت کے زمانہ کا نقشہ اور فوٹو

اب میں تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش کرتا ہوں۔ جو یہ ہے۔ کہ خدا کی باریک در باریک اور نہاں در نہاں حکمتوں اور مصلحتوں کے ماتحت حالات نے پلٹا کھایا۔ سکھوں نے غلبہ پایا۔ اور رام گڑھیا مسل کے سکھ فریب سے قلعہ میں داخل ہو کر قابض ہو گئے۔ قادیان کی دولت و ثروت اور اقتدار و حکومت کے زوال کے ساتھ ہی امن برباد۔ علم مفقود اور نیکی و نیکوکاری معدوم ہو کر فساد و جہالت اور بدی و بدکاری نیز فسق و فجور کا دور دورہ ہو گیا۔ نہ عزت۔ شریف اور امن پسند لوگ رام گڑھیوں کے آتے ہی خوف و ہراس کے مارے قصبہ کو چھوڑ عزت و آبرو دے کر خالی ہاتھ بھاگ گئے۔ اس تباہی و بربادی کا مختصر سا نقشہ میں سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود اور مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اپنے الفاظ میں درج کرتا ہوں۔ جو یہ ہے۔ کہ :۔

"اس وقت ہمارے بزرگوں پر بڑی تباہی آئی۔ اور اسرائیلی قوم کی طرح وہ اسیروں کی مانند پکڑے گئے۔ اور ان کی مال و متاع لوٹی گئی۔ کئی **مسجدیں** اور عمدہ عمدہ مکانات مسمار کئے گئے۔ اور جہالت اور تعصب سے باغوں کو کاٹ دیا گیا۔ اور بعض مسجدیں۔ کہ جن میں سے اب تک ایک مسجد سکھوں کے قبضہ میں ہے دھرم سالہ یعنی سکھوں کا معبد بنایا گیا۔ اس دن ہمارے بزرگوں کا ایک کتب خانہ بھی جلایا گیا۔ جس میں **پانسو نسخہ قرآن شریف کا** قلمی تھا۔ جو نہایت بے ادبی سے جلایا گیا۔ اور آخر سکھوں نے کچھ سوچ کر ہمارے بزرگوں کو نکل جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ تمام مرد و زن چھکڑوں میں بٹھا کر نکالے گئے۔ اور وہ پنجاب کی ایک ریاست میں پناہ گزین ہوئے"

(کتاب البریہ)

قضا و قدر کی نیرنگی اور زمانہ کی گردش نے گویا اس فارسی النسل خاندان کو پشتوں کی حکومت اور ریاست سے ایسا محروم کیا۔ کہ خالی ہاتھ یہاں سے نکل گئے۔ اور جو کچھ بنایا تھا یہیں چھوڑ گئے۔ آنے والے لوگوں نے آتے ہی جو کچھ کیا۔ اس کا خلاصہ آپ نے پڑھ لیا۔ بعد میں جو کچھ ہوا۔ اس کا اندازہ قادیان کی حالت سے کر لیں۔ جو میں نے بچشم خود دیکھی۔ اور وہ یہ تھی :۔

جدھر نظر اٹھاؤ ویرانہ و کھنڈر۔ عمارات برباد اور مکانات مسمار۔ بیسیوں گھر مقفل و بے چراغ۔ خال خال کوئی آباد۔ اور جو آباد بھی تھے۔ اُن پر بھی ایک قسم کی اداسی برستی دکھائی دیا کرتی تھی۔ جیسے کسی

اجڑے دیار کا سوگ

منا رہے ہوں۔ میرا اپنا اندازہ یہ ہے۔ کہ گاؤں کا تین چوتھائی حصہ غیر آباد یا تباہ و برباد پڑا تھا۔ اور بمشکل ایک چوتھائی حصہ آباد۔ جس میں زیادہ سے زیادہ پانچ سو نفوس رہتے ہوں گے۔ بازار دو تھے۔ ایک بڑا بازار کے نام سے موسوم۔ دوسرا چھوٹا بازار مگر وہ تو سنسان۔ چھوٹے بازار میں تو شاذ ہی کوئی دکان کھلی اور آدمی نظر آتا۔ سوائے دو **منحوس** اڈوں کے جو دن کی بجائے رات کو زیادہ کھلتے ہوں گے۔ باقی بازار بند اور گرا پڑا تھا۔ بڑے بازار میں چند دکانات کھلی دکھائی دیا کرتی تھیں۔ مگر کاروبار اُن کا بھی دیکھنے میں کوئی نہ آتا۔ خالی دکانوں پر نکمے بت بیٹھے ہوا کرتے یا دفع الوقتی کے لئے گھروں کی وحشت سے گھبرا کر بازار میں آ جایا کرتے۔ جہاں آنے جانے والوں کی شکل و صورت دیکھ لیتے یا پاسہ چوپٹ اور شطرنج وغیرہ کھیل کر دن گذار لیا کرتے یا بعض اس ٹٹی کی آڑ میں فلاکت زدہ کسانوں اور مزدوری پیشہ محتاجوں کا خون چوسنے اور پیٹ کاٹنے کی غرض سے سودی لین دین کر لیا کرتے۔ بازار محض نام کو تھا۔ کام کوئی تھا نہ ہنر اور پیشہ۔ تین دکاندار تھے۔ جو اس ویران بستی کی توہمت کہلاتے۔ ایک بزاز دوسرا عطار۔ تیسرا حلوائی۔ ایک مسلمان اور دو ہندو۔ اور ان میں کی آبادی بھی صرف اس ایک گھرانے کی بدولت تھی۔ جس کو خدا نے پھر سے

نئی زمین اور نیا آسمان

بنانے کے لئے چن لیا تھا۔ عطار کا کام سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندانی کمال فن طب اور فیض کا رہین منت تھا۔ یا حضرت نور الدین اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے مطب اور مریضوں کی وجہ سے۔ اور حلوائی کا مہمانوں اور بیماروں کی آمد و رفت کے باعث اور لالہ سکھ رام صاحب بزاز کی بکری بھی محض اسی گھرانے کے طفیل تھی۔ جو عموماً یتامیٰ و بیکگان اور غرباء کی ضروریات کے لئے خرید کر لیا

کرتے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ یہ کوئی دوکانیں تھیں۔ حلوائی کی ایک دوکان کی تفصیل لکھ دیتا ہوں۔ اس سے دوسری دوکانوں کا بھی قیاس کر لیں۔ چار یا چھ آنہ کا دودھ لے کر یہ لوگ صبح سے رات کے دس گیارہ بجے تک عموماً بیٹھا کرتے۔ دودھ بکتا جتنا بکتا۔ باقی سے کھوا بنا رہتا کبھی دہی۔ دہی نہ بکتا تو رات کو بھلے پکوڑیاں تیار ہوتیں۔ گاہک کوئی آگیا تو خیر ورنہ وہ بھی

گھر کی مرغی دال برابر

چار و ناچار یوں چکا دی جاتیں۔ یہی حال بتاشے مٹھائیوں کا ہوا کرتا۔

الغرض بازار نام کو تھے۔ دوسرا کام کی کوئی چیز۔ یا ضرورت کا کوئی سامان قطعاً میسر نہ آسکتا تھا۔ بالکل معمولی معمولی ضروریات زندگی کے لئے بٹالہ۔ امرتسر اور لاہور جانا ہوتا تھا اور نوددکنار زمینداری ضروریات مثل بیج بونے تک لوگ بٹالہ سے سروں پر اٹھا کر لایا کرتے۔ علاقہ کی پیداوار بھی بمشکل فصل کے ایام میں مل سکتی تھی۔ سب بنئے مہاجن اور ساہوکار شہروں کو لے جاتے۔ تو چند ہی روز بعد پھر بیچارے کسانوں اور مزدوروں بلکہ ہر طبقہ کے لوگوں کو شہروں سے جا کر لانی پڑتی تھیں گوشت اور سبزی کا بھی یہی حال تھا۔ قصاب دوسرے تیسرے روز بکرا کرتے۔ وہ بھی نہ بکتا تو دیہات میں لے جا کر قرض دام یا غلہ نکلنے کے وعدہ پر ادھار دے آتے۔ گوشت ایسا خراب ہوا کرتا۔ کہ دیکھنے کو جی نہ چاہتا۔ قصابوں کی بڑی جائداد کالی بھیڑیں ہوا کرتی تھیں۔ بکرا شاذ و نادر۔

بیکاری عام تھی

کیونکہ کام کے لوگ اپنی عزت و آبرو بچانے کی غرض سے بستی کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ پیچھے بے کار یا بدقماش رہ گئے تھے۔ یا سست اور کاہل۔ کام کے لوگ نکل گئے۔ تو نکمے پڑے رہے۔ جس کے نتیجہ میں مختلف قسم کی عادات قبیحہ اور افعال شنیعہ میں لوگ مبتلا تھے۔ قمار بازی کا بازار گرم رہتا۔ جس کے کئی اڈے قائم تھے۔ گرد و نواح کے بدقماش اور آوارہ لوگ آتے۔ پولیس چھاپے مارتی۔ لوگ دیوالیہ و کنگال ہوا کرتے تھے۔ رونق ہوا کرتی۔ ٹھیکہ کی دوکانوں پر ام الخبائث کا ٹھیکہ موجود۔ بھنگ۔ چرس۔ گانجا کے دم لگا کرتے۔ اور چنڈو کا استعمال ہوتا۔ افیون اور دھتورہ کا استعمال بھی عام تھا۔ حقہ نوشی اور مے کشی و سیفرنشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اور ان کے نتائج تلخ بھی لوگوں کو چکھنے پڑا کرتے تھے۔

صفائی کا یہ حال تھا۔ کہ جا بجا کوڑا کرکٹ اور نجاست کے تودے۔ گوبر اور گندگی کے انبار لگے رہا کرتے۔ جن کی وجہ سے ہر گھر سنڈاس اور کوچہ و گلی گندے نالے کا منظر پیش کرتے کوچوں کا یہ حال تھا۔ کہ دن کی روشنی میں بھی دشوار گذار تھے ٹیڑھے میڑھے کھنگر گلی کوچوں کو ناہموار اور ناقابل عبور بنائے ہوئے تھے۔ گندہ پانی اور موتیوں کا بول و براز کرا ہیت تعفن اور عفونت پیدا کرتے۔ کہ دماغ سڑا کرتا تھا۔

بعض میلے بھی ہوا کرتے۔ جن میں جاہلیت کے کمالات اور ہنر و جوہروں کا ایسا مظاہرہ ہوتا۔ کہ شرافت تو درکنار انسانیت بھی سر پیٹ لیتی اور مارے ندامت و شرمندگی کے

پانی بنکر یہ نکلتی

[illegible]

کے پاس لگا کرتا۔ ایک رات اور دن لوگ دُور دُور سے آکر اکٹھے ہوتے رات کو مست ہوئے مرد اور عورتوں کی ٹولیاں گند بکتیں۔ اور جس طرح کے گندے گیت گاتیں۔ اُن کے ذکر سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں بستی کے گلی کوچوں میں رات بھر وہ اودھم مچا کرتا۔ کہ الامان الحفیظ۔ لڑائی۔ دنگہ اور فساد جو عموماً چھیڑ خوانی کے نتیجہ میں ہوا کرتا۔ سر پھٹول اور پکڑ دھکڑ پر منتج ہوا کرتا تھا۔

عرب جاہلیت

کے میلے جہالت اور بدتہذیبی کے لئے ضرب المثل سنے جاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ میلے ہر رنگ میں ان پر سبقت لے جایا کرتے تھے۔ کیونکہ ان میلوں کا اکثر حصہ علم اور ادب۔ فصاحت اور بلاغت کے لئے وقف ہوا کرتا۔ جو اگر کبھی کھیلا جاتا۔ تو اس کی تہ میں غریب نوازی اور خدمت خلق کا جذبہ پنہاں ہوا کرتا تھا۔ یا اخراجات جنگ کی فراہمی مدنظر ہوا کرتی۔ مگر یہاں سرتا پا گالی گلوچ۔ گند اور ہزلیات و بکواس حیا سوز حرکات اور غیرت کش افعال جس پر طرفہ قمار بازی اور فتنہ و فسا۔ **خدا کی پناہ**

میں جس زمانہ کے چشمدید واقعات بیان کر رہا ہوں۔ وہ ۱۳۱۲ھ ہجری یا ۱۸۹۵ء کا زمانہ ہے۔ جبکہ یہ بستی خدا کے الہام اور کلام کے نزول اور سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے بعد کا زمانہ ہے۔ اور اس زمانہ میں یہ بستی

قادیان کی مقدس بستی

بن چکی تھی۔ نیک دل اور شریف تعلیم یافتہ لوگوں کا مرجع اور خداشناسی کا مرکز ہونے کی وجہ سے ترقی کی راہوں پر گامزن تھی اور بہت کچھ اصلاح بھی عمل میں آچکی تھی۔ باوجود اس کے ان حالات کی موجودگی بستی کی کچھ ہی عرصہ پہلے کی حالت ابتر کی مظہر ہے۔ کہ نوبت کہاں تک پہنچی ہوگی۔

گیدڑ۔ لومڑ اور بڑے بڑے جنگلی بلے تو سر شام ہی غلاظت اور سنڈاس کے ڈھیروں پر سنڈلائے لگا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض درندے اور وحوش رات کی تاریکی میں آتے اور بھیڑ بکری۔ مرغی۔ بطوں تک کو اٹھا لے جاتے۔ احمدیہ چوک کے شمال مشرقی کونہ کی دوکان جس میں آج کل شیخ احمد دین صاحب ڈنگوی بیٹھتے ہیں۔ کسی وقت حضرت نواب صاحب قبلہ کا باورچی خانہ تھا۔ جس کے آگے ایک پھاٹک لگا ہوا تھا۔ گوشت چونکہ یہاں عموماً خراب ملا کرتا۔ اور بعض اوقات ضرورت کے وقت مل ہی نہ سکتا تھا۔ لہذا حضرت نواب صاحب کے ہاں اس کا انتظام رہتا۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ بکرا وہاں بند تھا۔ رات کو ایک بھیڑیا آیا۔ اس نے پھاٹک کا ایک حصہ توڑا۔ اور بکرا اٹھا کر لے گیا۔

اس سے بھی بڑھکر

ایک اور چشمدید واقعہ سناتا ہوں۔ ایک روز دن دہاڑے ایک لمبے دانتوں والا جنگلی خنزیر شرقی ڈھاب میں ...... پانی پی اور نہا کر شکستہ فصیل کی راہ سے جہاں آج کل حضرت عرفانی صاحب کا مکان اور دفتر الحکم ہے بستی میں داخل ہوا۔ اور سیدھا ایک شخص مسمی دھنتو کے گھر میں جا گھسا۔ جہاں اس کی بیوی بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ عورت اس بدصورت خونخوار بلا کو دیکھ کر گھبرائی۔ گھبراہٹ میں اور کچھ نہ بن پڑا۔ تو ہاتھ سے دھتکارنے لگی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر چبا لیا۔

اور پھر خود دھوکا سے خائف ہو کر گاؤں کے گلی کوچوں ہی سے

ہوتا ہوا بستی کے غربی جانب سے نکل کر گنے کے کھیتوں میں جا گھسا۔ بعد آخر شکاری کتوں اور شکاریوں کا شکار ہو کر اپنی جرأت کی پاداش کو پہنچا۔ بھیڑیا جسے پنجابی میں بگھیاڑ کہتے ہیں۔ اس کثرت سے ہوگیا تھا۔ کہ موجودہ سٹیشن اور بستی کے درمیان ایک جوہڑ کا نام ہی

بگھیاڑاں والا چھپڑ

مشہور تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ گاؤں کے باہر بعض حصے ویرانی و بربادی کے باعث اتنے بھیانک اور ڈراؤنے ہو چکے تھے۔ کہ بھوت چڑیل کا مرکز کہلاتے۔ جہاں دن دہاڑے لوگ جاتے سے گھبرایا کرتے تھے۔ اس طرح گویا یہ بستی جو ایک قوم کے ذریعہ جنگل سے منگل بنی تھی۔ دوسری قوم کے ذریعہ پھر تنزل کر کے

منگل سے جنگل

آباد سے ویران اور علم و فضل۔ ہنر و حکمت اور نیکی و تقویٰ کی بجائے جہالت اور رذالت۔ بیکاری و جہالت۔ اور بدی و بدکرداری کا مرکز ہو چکی تھی۔ جہاں علم رہا نہ دولت۔ تجارت رہی نہ حرفت۔ زراعت رہی نہ حکمت۔ غفلت و سستی۔ بیکاری و بیماری اور بدی و بدکاری کا مستقر معدہ اور جہالت و ضلالت کا عمل تسلط تھا۔ جنگلی جانوروں اور درندوں کی وجہ سے کھیتیاں برباد ہوا کرتیں۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ شکاری لوگ اور شکاری کتے ان دنوں قادیان میں کثرت اور عزت سے پالے اور رکھے جاتے تھے۔

بات لمبی ہوئی جاتی ہے۔ مگر بے کچھے تسلی ہوتی ہے نہ حقیقت کھلتی ہے۔ لہذا نہایت ہی اختصار سے اشارات پر اکتفا کرتے ہوئے کچھ عرض کرتا ہوں۔ سب سے پہلی مشکل اس بستی کی گمنامی کی وجہ سے اس کی تلاش کی تھی۔ تو دوسرا بڑا بھاری مرحلہ قادیان پہنچنے کا تھا۔ ذرائع آمد و رفت کا اتنا فقدان تھا۔ کہ سواری کا میسر آنا ہی مشکل ہو جایا کرتا۔ سواری آجاتی کہ اس زمانہ میں۔ ریڑھ بیل گاڑی اور گڈا۔ زیادہ سے زیادہ

دقیانوسی یکّا

ہوا کرتا تھا۔ جس کی وضع قطع اور شکل و بناوٹ اس امر کی مقتضی ہوا کرتی تھی۔ کہ اسے یکّا کی بجائے شیطانی چرخا کے نام سے پکارا جائے۔ اور حقیقت بھی اس سواری کی اسی نام سے پوری طرح واضح ہوتی ہے۔ چلنے میں دھکوں کا لگنا حتیٰ کہ پسلیاں دکھ جایا کرتیں۔ پیٹ میں درد اٹھنے لگتا۔ اور جسم ایسا ہو جاتا کہ کسی نے اوکھلی میں دیکر کوٹ دیا ہو۔ اس کا چلتے چلتے مع سواری ہو جانا۔ الٹ جانا۔ سواریاں نیچے چرخا اوپر یہ باتیں طالبی یکّا لکھنے سے کیسے معلوم ہو سکتی ہیں۔

یکہ مل جانے کے بعد دوسری شکل یہ ہوا کرتی کہ یکہ بان غائب۔ وہ نہاری لینے چلا جایا کرتا اور جب تک کہ سواریاں ہاتھ نہ آجاتیں نہ اس کی نہاری تیار نہ ہو سکتی۔ اور اس طرح بہت سا قیمتی وقت یکہ بان کے انتظار یا تلاش میں ضائع ہو جایا کرتا۔ سڑک کی کیفیت لکھنے کی تو ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس کی تفصیل خود خداوند عالم الغیب نے

نیچ عمیق

[illegible]

نہ ہوا کرتا تھا۔ غلہ وغیرہ اجناس تمام گڈوں کے ذریعہ بٹالہ جایا کرتی تھیں۔ جس کی وجہ سے سڑک نہایت خستہ۔ ناہموار۔ اور خراب تھی یکہ کی ہیئت ترکیبی کچھ ایسی تھی۔ کہ اچھے سے اچھا موٹا تازہ اور نو بنو گھوڑا یکے میں لگنے کے چند ہی روز میں دبلا پتلا اور ایسا مریل ہو جایا کرتا۔ کہ دیکھنے والوں کے دل رحم سے بھر جاتے۔ راستہ کا اکثر حصہ سواریاں پیدل چلکر پہنچتیں۔ اور برسات کے موسم میں تو خدا کی پناہ بعض اوقات پورا پورا دن چلنے سے بھی قادیان نہ پہنچ سکتے۔ یکے پھنس جایا کرتے تو ایسی مصیبت ہوا کرتی۔ جو برداشت سے باہر ہو جاتی۔ سامان مزدوروں کے سروں پر اٹھوا کر منگایا جاتا۔ سواریاں پیدل آتیں۔ یکہ بان مجبور ہو کر گھوڑا کھول کرلے آتا۔

یکہ سڑک میں کھڑا

رہتا۔ اس کیفیت کی اگر تفصیل کروں۔ تو پوری ایک کتاب بن جائے۔ قادیان کی بستی نشیب میں واقع ہے۔ برسات کی وجہ سے چاروں اطراف سے پانی کا سیلاب آیا کرتا۔ جس سے گاؤں کے گرد کی ڈھابیں۔ کھائیاں اور خندقیں بھر جایا کرتیں۔ اور اور نالہ پانی ڈیڑھ میل تک قریباً بٹالہ قادیان کی سڑک میں سے ہی گذرا کرتا۔ جو بعض اوقات اتنا گہرا۔ تیز اور زور سے چلتا کہ اس میں سے سلامت گذر جانا ہر کسی کا کام نہ تھا۔ گاؤں صحیح معنوں میں ایک جزیرہ ہو جایا کرتا۔ دیہات و مضافات سے آنے والے اور مسافر کیا عورت کیا مرد کپڑے اتار کر برہنہ ہو کر گاؤں میں پہنچا کرتے۔ اور یہ منظر نہایت ہی ناگوار اور غیرت کش ہوا کرتا تھا۔

اس زمانہ میں جائیداد کی کوئی قیمت تھی نہ قدر۔ زمین و مکان کوڑیوں کے مول بکتے۔ کوئی خریدار تھا نہ گاہک۔ چنانچہ قلعہ کی فصیل جو گورنمنٹ برطانیہ کی ملکیت قرار پا چکی تھی۔ اور کاغذات سرکاری میں نزولی رقبہ کہلاتا تھا۔ جب حکومت نے نیلام کرنا چاہی۔ تو کئی مرتبہ ناکامی ہوئی اور نیلام کنندہ حکام ناکام واپس چلے گئے۔ کیونکہ کوئی اس کے خریدنے کو تیار نہ ہوتا۔ آخر سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے ابتدائی زمانہ میں آخری مرتبہ نیلام ہوا۔ اور فصیل کی زمین

مفت کے برابر

برائے نام قیمت پر لوگوں کے گلے منڈھ دی گئی۔ مرزا محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم جو اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کارندہ تھے۔ انہوں نے بھی خاندانی مکانات کے سامنے کی زمین کی بولی دیکر بہت ارزاں خرید لی۔ مرحوم بیان کیا کرتے تھے۔ کہ میں خوشی خوشی حضرت کے حضور گیا۔ اور اپنی طرف سے بطور خوشخبری یہ خبر سنائی۔ مگر حضرت نے فرمایا:۔

"اسمٰعیل ہم نے یہ زمین کیا کرنی ہے۔ آپ نے بے پوچھے کیوں خرید لی؟ ہمارے کس کام کی ہے اور ہمارے پاس تو روپیہ بھی نہیں"

مرزا اسمٰعیل صاحب بیان کیا کرتے تھے۔ کہ میں بولی دے چکا تھا۔ انکار ہو سکتا تھا نہ واپس کی جا سکتی تھی۔ اور نہ ہی کوئی اور اسے خریدنے کو تیار تھا۔ مجبوراً میں نے قرض دام کر کے [illegible] حضرت کو میرے اس فعل کا علم ہوا۔ [illegible] ایک بار دو مرتبہ کر کے مجھے ادا کر دی۔ [illegible] کی اہم ضروریات میں کام آئی۔ میسرا

اندازہ ہے۔ کہ اگر آج یہ زمین خریدنی پڑتی۔ تو موقعہ کے لحاظ سے کم از کم سو گنا زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی۔

تعلیم کا یہ حال تھا۔ کہ اس خاندان اور اس سے تعلق رکھنے والوں کو الگ کر کے بمشکل ایک یا زیادہ سے زیادہ دو فیصدی معمولی نوشت و خواند کے آدمی مل سکتے ہوں گے۔ صرف ایک بالکل ہی چھوٹا سا

دیہاتی پرائمری سکول

تھا۔ جو ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے چلایا جا رہا تھا۔ دوسرا کوئی مکتب تھا نہ مدرسہ۔ اسی سکول کے ایک ماسٹر کو دو چار روپیہ الاؤنس دیکر **ڈاکخانہ** کا انچارج یا برانچ پوسٹماسٹر بنا دیا جایا کرتا۔ جو صبح و شام ایک گھنٹہ ڈاک کی آمد اور روانگی نیز دیگر کاموں کے لئے دیا کرتا۔ ڈاک بٹالہ سے ایک ہرکارہ کے ذریعہ ایک مرتبہ ایک چھوٹی سی تھیلی میں آیا کرتی۔ جو تقریباً تمام کی تمام ہی حضرت مسیح موعود علیہ السلام یا حضور کے فلاسوں کی ہوا کرتی تھی۔ گاؤں میں شاذ ہی کسی کا کوئی خط ہوا کرتا۔ اور اگر کسی کا خط آ بھی جاتا۔ تو اس کو پڑھانے کے لئے اس کو در بدر اور کو بکو پھرنا پڑتا۔

لباس اس علاقہ کے لوگوں کا اتنا مختصر کہ عریانی اور ستر عورت بھی نہ ہوا کرتی۔ نیم برہنہ کہنا گویا لغت میں تصرف کرنا ہوگا۔ کیونکہ حقیقتہً عوام بالکل ننگے اور برہنہ ہوا کرتے تھے۔ چار انگل کی ایک لنگوٹی اُن کا لباس تھا۔ جس کو دیکھکر بعض اوقات

سیدنا حضرت نورالدین اعظم رضؓ

ان سے ایک سوال کیا کرتے۔ مگر تعجب ہے۔ کہ وہ کچھ ایسے بے حس ہو چکے تھے۔ کہ اُن کا جواب اُن کے لباس سے بھی زیادہ مکروہ اور ننگا ہوتا تھا۔ مستورات باوجود اس کے نام ہی میں ستر اور پردہ لازم قرار دیا گیا تھا۔ عموماً بے پردہ پھرتیں۔ رات کو سونے میں برہنگی اور ایک نہایت ہی قبیح رسم آدھ ہڑونجا کی لعنت میں مبتلا تھیں۔

زبان اتنی موٹی۔ بھدی اور کرخت تھی۔ کہ کان اس کی برداشت نہ کر سکتے۔ گالی کے بغیر ان کی بات مکمل نہ ہوا کرتی۔ اور کلام میں حلاوت و شیرینی پیدا کرنے کے لئے پھکڑ بازی لازمی تھی۔ بچوں کو بچپنے ہی سے اس کا مشاق بنایا جاتا۔ اور گالی گلوچ کی باقاعدہ تعلیم دی جایا کرتی۔ اور جب بچہ اس علم میں طاق ہو کر باپ یا بڑے بوڑھوں کو منہ پر گالی دینے کے امتحان میں کامیاب ہو جاتا۔ تو

واہ وا

کی صدا گونج اٹھتی۔ اور ہر طرف سے داد ملنے لگتی۔ غرض گالی لوگوں کی عادت اور لازمہ سخن ہو چکی تھی۔ اور اظہار محبت و پیار کے لئے تو یہ چیز ایسی ضروری تھی۔ جیسے کھانے میں نمک

مساجد اس زمانہ میں چار تھیں۔ مسجد مبارک جو دراصل مسجد البیت تھی۔ جس کا نام بیت الذکر تھا۔ یہ مسجد سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود بنوائی تھی۔ دوسری مسجد اقصیٰ تھی۔ جو حضور پُر نور کے والد ماجد

حضرت مرزا غلام مرتضٰے صاحب

نے بنوائی۔ انہی کا مزار مبارک آج کل مسجد اقصٰے کے وسط میں زیر گنبد ہے۔ انہوں نے یہ مسجد کن حالات اور کس نیت سے بنائی۔ یہ وہ خدا تعالیٰ کے فعل اور مسجد کی مقبولیت سے ظاہر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی فعلی شہادت سے بڑھ کر اور کیا چیز انسانی اعمال اور اس کی قلبی کیفیات کے نیک و بد کی گواہ ہو سکتی ہے؟

حکم خاتمہ و انجام کی نوعیت

پر لگا کرتے ہیں۔ کون جانتا ہے۔ کہ اس مقدس انسان نے خاندانی ریاست اور آبائی جائیداد کے حصول کی کوششیں کس نیت اور ارادہ سے کی تھیں؟ کون سمجھ سکتا ہے۔ کہ اُن کی یہ ساری تگ و دو کن اغراض و مقاصد کے لئے تھی؟ کس کو اس بات کی خبر ہے۔ کہ انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر اور نہایت قیمتی حصہ کس چیز کے حصول میں خرچ کر دیا؟ اس بات سے کون مطلع ہے۔ کہ انہوں نے اپنی عمر کا سارا اندوختہ اور ستر ہزار روپیہ کس نمائش و مرام کی تلاش میں اڑا دیا؟ اور کون اس امر سے آگاہ ہے۔ کہ وہ یہ کہتے ہوئے۔ کہ:۔

"ورنہ میں جانتا ہوں۔ کہ جس طرف اس کی (مسیح موعود) توجہ ہے۔ یعنی دین کی طرف۔ صحیح اور سچ بات یہی ہے۔ ہم تو اپنی عمر ضائع کر رہے ہیں"

حضرت کو بھی اپنے ساتھ دنیوی کاموں میں شریک ہو کر دنیادار اور دو گلی بنا لینے کی کوشش کس خیال سے فرمایا کرتے تھے؟

اللہ اور صرف اللہ

ہی کی ذات ہے۔ جو ان کے قلب کی گہرائیوں اور اندرونی بھیدوں سے واقف۔ قلبی کیفیات سے آگاہ اور نیت کی حقیقت کا رازدان ہے۔ اس کی میزان صحیح اور ناپ درست۔ اس میں غلطی ناممکن ہے۔ پس خدا تعالیٰ جس طرح اپنی قدرت نمائی سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کی مرضی اس کی فعلی شہادت سے پائی جا سکتی ہے۔

حضرت مرزا صاحب مرحوم کا دنیوی ناکامیوں اور نامرادیوں کے بعد مغموم و محزون رہنا۔ اور یہ کہتے رہنا۔ کہ:۔

"جس قدر میں نے پلید دنیا کے لئے سعی کی ہے۔ اگر میں وہ سعی دین کے لئے کرتا۔ تو شاید آج قطب وقت یا غوث وقت ہوتا"

ایک پاک تبدیلی اور تبتل الی اللہ کی وسیع دلیل اور قوی برہان ہے۔ اور حضرت ربی بصحیح العزائم کا مقولہ ان کے نیک صورت پا جانے کا ثبوت گو اس کے علاوہ یہ

عمر بگذشت و نماند است جز ایامے چند
بہ کہ در یاد کسے صبح کنم شامے چند

نیز

از درے تو اے کس ہر بیکسے
نیست امیدم کہ روم نا امید

اور

یاب دیدہ عشاق و خاکپائے کسے
مرا دلے است کہ در خوں تپد بجائے کسے

ان اشعار کی حقیقت سے آشنا ہیں جس دل سے کہے اور بار بار پڑھا جایا کرتے تھے۔ اس کی کیفیت کا واقف علیم و خبیر تا دیر تو اپنا خدا ہے۔ بیشک

عجل جسد لہ خوار

خدا کے حضور خالی ہاتھ جانے کی حسرت کا احساس ایک سلیم دل اور قلب صافی کی بیچارگی ہیں ارحم الراحمین خدا کے حضور شرف قبولیت پائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ خدا نے اُن کی دنیا اور دنیا کے سارے ہموم و غموم کو دین خالص اور اپنی ذات کی جستجو و طلب میں سعی و کوشش بنا کر قبول فرمایا تھا۔

ان سب باتوں کے ساتھ سب سے اہم اور بڑی بات سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعائیں ہیں جو حضور ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور کیا کرتے تھے بیچینی و اضطراب۔ گداز اور سوز و نیاز سے کی جاتی ہوں گی۔ وہ انسان کامل جو نہ صرف بیگانوں اور غیروں بلکہ اپنے جانی دشمنوں تک کے لئے انتہائی درد رکھتا ہو۔ اور ان کی بہبودی کے واسطے اپنی جان عزیز تک گداخت کر دینے کا عادی ہو۔ اپنے شفیق باپ کے لئے کیا نہ کرتا ہوگا خصوصاً جبکہ ناکامیوں کی وجہ سے وہ دردمند۔ مغموم اور مہموم رہتے ہوں۔ تو حضرت کا رحیم کریم اور سلیم دل اُن کی شفاعت کے لئے کیوں نہ ...... گداز ہو کر آستانہ الٰہی پہ بہنے لگتا ہوگا؟ ان باتوں اور اُن کے دیگر احوال کو یکجائی نظر سے دیکھنے سے اُن بزرگ مرحوم و مغفور کا۔

مقام عالی

قرب اور وصال سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ اور دل اُن کی محبت سے بھر جاتا۔ اُن کی عظمت سے ڈر جاتا۔ اور بے ساختہ دل سے دعائیں نکلنے لگتی ہیں۔ علی الخصوص جبکہ ان کے نیک انجام خاتمہ بالخیر اور وصال الی اللہ کا سانحہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے

عزیٰ پرسی

کے معاملہ پر غور کیا جائے۔ تو اس بزرگ ہستی کی قدر و قیمت اور مرتبہ و مقام کی رفعت و بلندی معلوم ہوتی ہے۔ کتنے ہیں دنیا میں ایسے انسان جن کی وفات پر خدا نے اولاد کو پیغام بھلا دی بھیجا ہو؟ سبحان اللہ۔

ما اعظم شانہ

ان کا آخری عمل یعنی تعمیر مسجد اور آخری خواہش۔ کہ اسی ”مسجد کے ایک کونہ میں میری قبر ہو۔ تا اللہ جل شانہٗ کا نام میرے کان میں پڑتا رہے۔ کیا عجب کہ یہی ذریعہ مغفرت ہو۔“

قادیان کے عروج کے زمانہ کی مساجد کے حالات اور تذکرے

اُن کی خوبصورتی۔ وسعت اور شان و شوکت کی روایات اور آبادی و معموریت کی داستانیں۔ آپ نے اپنے بزرگوں سے سنی ہوں گی۔ جن میں قادیان آ بیٹھنے والے علماء۔ فضلاء۔ حفاظ اور اولیاء و اقطاب کے علاوہ آس پاس کے قلعوں کے حکام و امراء کے علاوہ افواج اور ان کے سردار

ہر جمعہ کو جمع

ہوتے۔ اور نمازیں گزارا کرتے تھے۔ اُن کی یاد کتنی دلدوز اور روح فرسا ہوتی ہوگی۔ جن میں سے حضرت مرزا صاحب مرحوم نے کوئی بھی نہ دیکھی۔ اور جو ایک مسجد البیت دیکھی۔ تو وہ بھی

دھرم سالہ کی شکل

میں سکھوں کے قبضہ میں۔ کتنا درد اٹھتا ہوگا اُن کے دل میں اور کیا حالت ہوتی ہوگی اُن کے قلب کی؟ اپنی کوئی مسجد نہ دیکھ کر اُن کے دل میں مسجد بنانے کا جوش پیدا ہوا۔ خدا نے توفیق بھی رفیق فرمائی اور وہ مسجد بن گئی۔ مسجد موجود ہے۔ اس کی شکل و صورت اور بناوٹ۔ خوبصورتی و مضبوطی اس

عظیم انسان

کے جذبات کی مظہر ہے۔ گئے گذرے دنوں اور عمر بھر کی ناکامیوں اور مایوسیوں کے بعد جس خاندان کے ایک فرد نے ایسی مسجد تعمیر کرائی اس کے برسر حکومت و اقتدار بزرگوں نے کیسی خوبصورت۔ وسیع اور شاندار مساجد بنائی ہونگی؟ لوگوں نے مقامی حالات اور بستی کے مسلمانوں کی بے دینی و جہالت کے مد نظر عرض بھی کیا۔ کہ اتنی بڑی مسجد بناتے ہیں۔ نمازی کہاں سے آئیں گے۔ مگر آپ نے بنائی اور بنائی جسے خدا نے قبول کیا۔ اور بڑھایا۔ اور ابھی بہت بڑھائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

تیسری مسجد محلہ ارائیاں اور چوتھی حلقہ خوجیاں میں تھی۔ اور یہ دونو بالکل چھوٹی۔ ویران اور غیر آباد پڑی تھیں۔ ان کی بناوٹ اور وضع سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پرانی اور قدیم نہیں۔ بلکہ ایّام امن اور قریب زمانہ کی بناوٹ تھیں۔ ایک عرصہ تک ہم لوگ عموماً غسل وغیرہ کے لئے وہیں جایا کرتے۔ کیونکہ غسل خانے صرف انہی میں تھے۔ نوافل بھی ادا کر لیا کرتے۔ یا بعض آس پاس رہنے والے دوست فرائض بھی ان میں پڑھا کرتے رہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ اس زمانہ میں ان کی مرمت و آبادی اور ڈول رسی کے۔ چندوں میں بھی احمدی غیر احمدی کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ سبھی حسب توفیق حصہ لیا کرتے۔

آبنوشی اور دیگر ضروریات کے لئے کنواں صرف ایک وہی جو

مسجد اقصیٰ

کے صحن میں حضرت اقدس کے والد بزرگوار حضرت میرزا غلام مرتضیٰ صاحب نے اپنی عمر کے بالکل آخری حصہ میں بنوایا۔ حضور کے حصہ میں آیا۔ دیوان خانہ میں بھی ایک کنواں تھا۔ مگر وہ حضور پُرنور کے بڑے بھائی صاحب کے حصہ میں چلا گیا۔ حضرت کے گھر اور مہمانوں کے ہاں تو سقّے بہشتی جہاں سے چاہتے پانی لے آتے۔ مگر ہم لوگوں کو اپنی ضرورت کے لئے مسجد اقصیٰ ہی کے کنوئیں پر جانا پڑا کرتا تھا کیونکہ ایک طرف تائی صاحبہ مخرمہ تو دوسری طرف مرزا امام الدین اور مرزا نظام الدین صاحبان ڈانٹ ڈپٹ کیا کرتے۔ اور بعض اوقات ناقابل برداشت طعن و تشنیع تک نوبت پہنچا دیتے۔ پس اس طرح ہمارے لئے صرف ایک

خدا کے گھر کا کنواں

کھلا تھا۔ جس طرح خدائے عالم و عالمیان نے اس مقدس و مقبول الٰہی بزرگ۔ قطب اور غوث انسان کے دو بیٹوں میں سے ایک کو اپنے نور کا سرچشمہ اور فیوض کا منبع بنا کر ہمیں اس تک پہنچا دیا۔ اور وہ اکیلا ہی خلق و جہان کے ورثہ میں آیا۔ اسی طرح آپ کے ترکہ مادی کے دو کنوؤں میں سے ایک اور صرف ایک ہی کنواں آنے والی پیاسی دنیا کے لئے کھلا تھا۔ جو فضل الٰہی سے اس نواح میں اپنے پانی کی لطافت و پاکیزگی۔ صحت افزائی و خنکی نیز ہضم اور خواص کے لحاظ سے بھی ممتاز ہے۔

مہمان خانہ اس زمانہ میں ابھی کوئی نہ تھا۔ سیدنا حکیم الامت حضرت مولانا نور الدین اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مطب ہی میں آنے والے مہمان قیام کیا کرتے۔ اور یہی جگہ سب کے لئے کافی اور وافی ہوا کرتی تھی۔ یا پھر حضرت اقدس کا الدار بطور مہمان خانہ استعمال ہوتا تھا۔

لنگر خانہ بھی علیحدہ کوئی نہ تھا۔ بلکہ حضرت اقدس کے مکان کے اندر ہی ملک غلام حسین صاحب سالن وغیرہ تیار کرتے اور اندرونی خادمات تیار کر دیا کرتیں۔

وفتر تھا اس زمانہ میں کوئی نہ محکمہ نظارت و وزارت۔ مہمان نوازی و مسافر نوازی اور غریب نوازی اور کیا تالیف و تصنیف طباعت و اشاعت۔ بیمار پرسی و عزا پرسی۔ الغرض تمام دینی کام تنہا سیدنا حضرت اقدس ہی کو کرنے پڑتے۔ سب افکار و سارے انتظام صرف اور صرف حضور کے ذمہ تھے۔ جن کو نہایت خوش اسلوبی اور بطریق احسن سرانجام پہنچایا جاتا۔

الغرض یہ بستی اپنے عروج و اقبال کے بعد بعض مصالح الٰہی کے ماتحت دوبارہ ویرانہ و جنگل میں تبدیل ہو کر گمنامی و قعر مذلت میں غرق ہو کر بالکل ایک چھوٹی سی بستی کی شکل میں تبدیل ہو چکی تھی۔ جہاں کوئی پریس تھا نہ اخبار۔ کارخانہ تھا نہ تار۔ بجلی تھی نہ فون۔ ریل تھی نہ ڈیزل کار۔

سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام گاؤں کی اراضیات اور جائداد کے علاوہ بعض دیہات کی تعلقہ داری میں بحیثیت ایک رئیس و مالک تھے۔ مگر حضور چونکہ دنیا اور اس کی عظمت و حشمت۔ مال و منال اور شغل و اشتغال نیز علائق سے منقطع ہو کر صرف خدا اور اس کے دین۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مخلوق کی ہمدردی و خدمت۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت و عظمت اور خدا کے نام کے اعلاء اور جلال کے اظہار کے لئے وقف ہو چکے تھے۔ حضور کو اپنی کسی زمین کا علم تھا نہ جائیداد کا پتہ۔ جو جس کے قبضہ میں تھی وہی اس کو استعمال کرتا اور فائدہ اٹھاتا۔ حضور کو

لینے کی بجائے دینے

پڑا کرتے۔ خرچ آمد سے زیادہ ہو جاتا۔ اور مالیہ و لگان بھی حضور کو اکثر اپنی گرہ سے ادا کرنا پڑتا۔ اس طرح حضور اس جائداد کے لحاظ سے مزارعین یا کارندوں کے رحم پر تھے۔ شرکاء حضور کے دنیوی لحاظ سے اپنے فن کے ماہر۔ علم کے پکے اور ٹھاٹھ کے پورے تھے۔ وہ برسر اقتدار تھے۔ اور ان کا دبدبہ و **لاٹھی** چلتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی تجلّی۔ رجوع خلق۔ اور حضور کے فنا فی اللہ۔ فنا فی الرسول اور فنا فی الدین ہو جانے اور اپنے بیگانوں کو اسی رنگ میں رنگین کرنے کی مساعی کی وجہ سے اور استقبال الی اللہ کے باعث انہیں حضور سے

خدا واسطے کا بغض

قلبی عناد اور دلی عداوت تھی۔ حضور کا عروج اُن کو ایک آنکھ نہ بھاتا۔ اور وہ ہمیشہ درپئے آزار رہتے۔ ہنسی مذاق اور تمسخر و استہزاء سے بھی بہت آگے نکل جایا کرتے۔ زہد سعید خداجاسدیں(؟) دکھائی دیا کرتا۔ ان حالات کو دیکھ کر ایمان اور بھی بڑھ جایا کرتے۔ کیونکہ قول خداوندی

اذا انصر اللّٰہ المؤمن جعل لہ الحاسدین فی الارض

کی صداقت روزانہ آنکھوں سے دیکھنے کا موقعہ ملا کرتا۔ ملکیت کے لحاظ سے وہ تینوں بھائی مل کر بھی حضرت کی ملکیت سے قریباً ½ پر تھے۔ مگر زور و جور کے لحاظ سے ایسا نظر آیا کرتا۔ کہ گویا وہی مالک و حاکم ہیں۔ اور تفاصیل کو چھوڑتا اور اُن کی ایذا رسانی کی صرف ایک ہی مثال درج کرتا ہوں۔ جو جماعت میں

مقدمہ دیوار